منشایاد کے افسانوں میں معاشی پہلو

شائستہ شریف، پی ایچ۔ڈی سکالر

ABSTRACT

Mansha Yad is a renowned story writer, of second half of the twentieth century. He highlights social, political, psychological cultural and especially economic aspects of the period in his short stories. This article seeks to explore the economic dimensions of prevalent socioeconomic structures as highlighted in his stories.

منشایاد نے بیسویں صدی کے نصف آخر سے تعلق رکھنے والے معاشی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔یہ وہی دور ہے جب ترقی یافتہ دُنیا میں "خُدا کی موت" (روشن خیالی کی تحریک) کے بعد" آدمی کی موت" (مشینوں کا غلبہ) کا چرچا ہے اوراس کے دوتین عشروں کے بعد ہی زندگی معنی کی موت کا نظارہ کرنے جارہی ہے۔ یعنی ترقی یافتہ دُنیا صنعتی دور سے ٹیکنالوجی کے دور میں جست لگارہی ہے۔اس وقت پاکستان سمیت پسماندہ ممالک اپنی معیشتوں کو جاگیرداروں کے چُنگل سے چھڑا کر سرمایہ داروں کی جھولی میں ڈالنے کی تیاری کررہے تھے۔

پاکستان میں بیسویں صدی کی چھٹی دہائی صنعتوں کے فروغ کا زمانہ ہے۔سرمایہ داروں کو خصوصی مراعات ٹیکسوں کی چھوٹ،قرضوں کا حصول اور بیرونی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی صنعتی کے لئے کئے جانے والے اقدامات تھے۔اِن اقدامات کے نتیجے میں ارتکاز دولت کے مسلئے نے جنم لیا۔

درحقیت جدیدیت کی لہر کے زیر اثر معاشرے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اُنکے نتیجے میں وسائل پیداوار اورثمرات پیداوار کا ارتکاز ہوا۔کارل مارکس نے برسوں پہلے اس خطرے کو بھانپتے ہوئے اپنے فلسفے میں ذرائع پیدا وار کو بنیادی اہمیت دے کر معاشی تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی۔یہ الگ کہانی ہے کہ مارکسزم کے تجربے نے شکل بدل کرایک اور طرح کے ظلم، ناانصافی اور طبقاتی تقسیم کو جنم دیا۔نظریاتی طور پر انتہائی دلکش نظام عملی میدان میں،اندرونی اور بیرونی اسباب کی وجہ سے منہدم ہوگیا۔لیکن اس کے تحت ادب میں جو نئی جہت متعارف ہوئی اُسکی بازگشت اب تک سُنائی دیتی ہے۔عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو ادب میں بھی اس تحریک کے زیر اثر قابل قدر کام ملتا ہے۔منشایاد کے پیش روؤں میں پریم چند کے ہاں کہیں کہیں جبکہ احمد ندیم قاسمی،شوکت صدیقی اور سب سے بڑھ کر کرشن چندر نے طبقاتی تقسیم کے تحت استحصال زدہ طبقے کی زندگی اور سرمایہ داروں کے ظلم کو اپنے افسانوں میں اُجاگر کیا ہے۔کرشن چندر کا افسانہ "عورتوں کا عطر"،سرمایہ داروں کی حریص ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے۔تو اسکی بستی

میں بسنے والے " کالو بھنگی" اور " کچرا بابا"، استحصال زدہ طبقے کی مظلومیت سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔منشا یاد کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اس معاشی استحصال کی جڑیں، ہزاروں سال قبل کی مٹی ہوئی تہذیبوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے "زوال کے اسباب میں" وہ بات کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

> اگر کھوپڑیاں کُھدائی کے وقت ملبے کی مختلف سطحوں (Layers) سے برآمد ہوئی ہوتیں تو یہ امر اس قدر حیران کُن نہ ہوتا۔مگر صورتحال اس سے بالکل مختلف ہے یہاں تک کہ ان دو کھوپڑیوں کے درمیان بھی نشو نما اور ارتقاء کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق ہے۔ جو گودام کے ایک دروازے کے اندر اور باہر سے بیک وقت برآمد ہوئی ہیں" [۱]

درحقیقت مسئلہ اسقدر سیدھا اور سادہ ہرگز نہیں۔ بات معاشی وسائل کی نامنصفانہ تقسیم پر ختم نہیں ہوتی۔ اس تفریق اور طبقاتی تقسیم سے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔سرمایہ درانہ نظام میں یہ مسلمہ اصول ہے کہ دولت مزید دولت کو جنم دیتی ہے۔غربت اور محرومی کی کوکھ سے محرومی ہی پیدا ہوتی ہے۔غربت کے اندھیروں میں بھٹکتا ہوا طبقہ اپنی نسل کو نہ اچھی صحت دے سکتا ہے اور نہ ہی اچھی تعلیم۔ اکثر اوقات تو معاشی تنگ دستی " کوکھ پر پاؤں" [۲] کے " حاجی صاحب" جیسے کرداروں کو جنم دیتی ہے۔اس محرومی کی بدولت ذہانت اور قابلیت پر بورژوا کے حق کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے شب و روز فیکٹری میں محنت سے پیدا ہونے والی قدر زائد پر پیداواری عمل سے دور مگر سب سے زیادہ فائدہ اُٹھانے والے سرمایہ دار کا حق ٹھہرتا ہے۔ یہی رشتہ جاگیر دار اور مزارع کے درمیان صدیوں سے قائم ہے۔ وسائل پر صدیوں سے چلا آرہا ایک مخصوص طبقے کا قبضہ استحصال زدہ نسلوں کو ذہنی غلامی اور پسماندگی کا شکار کر دیتا ہے۔امیر،غریب کی تقسیم کو مہمیز کرتے یہ اسرار دیکھ کر منشا یاد یہ سوچتے ہیں کہ جسمانی طور پر ایک ہی عہد میں رہنے والے ذہنی طور پر ایک دوسرے سے الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔

نوعِ انسان نے اور دوسری مخلوقات میں امتیاز تو اس بناء پر قائم کیا جا سکتا ہے کہ انسان تجربے اور مشاہدے سے سیکھتا ہے اور غلطیوں کو دوہرانے کی بجائے اپنے لئے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔مگر پسماندہ اقوام کی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ بھی شاید یہی ہے کہ یہاں کے حکمران اور دانشور اس بصیرت سے محروم رہتے ہیں اور شکستہ راستوں پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اُن کی کم بصیرتی کے ساتھ ساتھ تن آسانی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ ساٹھ کے عشرے میں پاکستان میں صنعت کا فروغ درحقیقت عام آدمی کے مصائب کو دور کرنے کے لئے نہ تھا۔نہ ہی اس کا مقصد اجتماعی قومی مفاد تھا۔ یہ سرمایہ داروں کے اُن مفادات کا تحفظ تھا جو ترقی یافتہ دنیا میں افادیت کا بیشتر حصہ سمیٹنے کے بعد نئی زمینوں کو فتح کرنے نکلے تھے۔ پھر یہاں بھی غریب طبقہ جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں کی ہوس کا ایندھن بننے لگا۔منشا یاد اپنے افسانے میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کو یوں بے نقاب کرتے ہیں۔

> "بوٹیاں انسان کو کتنی اچھی لگتی ہیں۔ بوٹی جہاں کہیں بھی وہ اُتار لیتا ہے۔بوٹی بوٹی کر کے سارا ماس کاٹ لیتا ہے۔بُوند بُوند کر کے سارا لہو نچوڑ لیتا ہے۔کرچی کرچی کر کے ساری ہڈیاں چبا لیتا

ہے۔کام لیتے وقت چربی گال دیتا ہے۔مزدوری دیتے وقت چمڑی اُدھیڑ لیتا ہے۔بھول چوک ہو جائے تو کان سے پکڑ کرنوکری سے نکال دیتا ہے۔لاکھ چیخو چلاؤ کچھ نہیں سُنتا،معاف بھی نہیں کرتا،بقایا بھی نہیں دیتا۔دھتکار کرشہر کی سڑکوں پر بھوکوں مرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے"۴؎

استحصال سے انسانوں کی ایسی کھیپ سامنے آتی گئی۔جن کے لئے روٹی اور کپڑے کا حصول ہی زندگی کا مقصد ٹھہرا اور منشایاد نے ایسے ہی انسانوں میں سے اپنے افسانوں کے کردار چُنے ہیں۔

صنعت کے فروغ کے ساتھ ہی دیہات کے ہنرمندوں کا معاشی جدوجہد میں کردار تبدیل ہو گیا۔خوشحالی کی تلاش میں دیہات کی کثیر آبادی شہروں کی طرف ہجرت پر مجبور ہو گئی۔ان ہجرت کرنے والوں میں اَن پڑھ مزدوروں کے ساتھ ساتھ وہ افراد بھی تھے جو شعوری سطح پر اپنے طبقے سے کچھ بُلند ہو گئے تھے اور اب اپنا دائرہ توڑ کر باہر نکل رہے تھے۔منشایاد خود بھی اس ہجرت کا شکار ہوئے۔ساٹھ کے عشرے میں دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔انجینئر ہونے کی حیثیت سے منشایاد نئے دارالحکومت کی تعمیر میں بذاتِ خود شریک تھے۔اُنہوں نے وہاں ٹھیکیداروں کی منافقت اور دھوکہ دہی کا بھی مشاہدہ کیا اور مزدوروں کی سادگی کا بھی اسی لئے وہ کہے بنا نہ رہ سکے۔

"مشین جان بوجھ کر خراب کی گئی ہے تم لوگوں سے بے انصافی ہو رہی ہے"۵؎ زندگی کے معاشی پہلو کو اُجاگر کرتا ہوا منشایاد کا افسانہ "راستے بند ہیں" ان کا اس موضوع پر نمائندہ افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔وہ اس شہروں کی پُر رونق اور رنگین زندگی میں ایسے افراد کے جذبوں حسرتوں اور خواہشوں کو بے نقاب کرتے ہیں جو زندگی کے ایک ہی ذائقے سے آشنا ہوتے ہیں۔جو خالی جیب خالی ہاتھ آنکھوں میں کھانے کی طلب رکھنے کا جرم کرتے ہیں۔جو قمیض کے پھٹے ہوئے دامن میں اپنی خودداری چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور بالآخر ان جرائم کا تاوان اپنی زندگی دے کر ادا کرتے ہیں۔"راستے بند ہیں" کا مرکزی کردار "وہ" اس طبقے کا نمائندہ ہے جو خاندانی شرافت اور حالات کی جبریت کا شکار رہتا ہے وہ بھوک کا عذاب اس لئے نہیں بھوگ رہا کہ اس کے پاس روٹی کی قلت ہے۔بلکہ یہاں بھوک کا تعلق اس کے اردگرد سجے ہوئے میلے سے ہے۔سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی آواز،سیخوں میں پروئے مرغ،قلاقند،حلوہ پوری،فالودہ،پھل اور طرح طرح کی مٹھائیاں جو میلے میں اس کے اردگرد موجود ہیں اُسے بھوک کی شدت اور اپنی محرومی کا احساس دلاتی ہیں اسے ان تمام چیزوں تک رسائی رکھنے والوں اور اپنے درمیان فرق سے آشنا کرتی ہیں۔مگر یہ آشنائی اس کے ذہن میں سوال کو جنم دیتی ہے۔"جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ذائقے سے محروم کیوں ہوں"۶؎۔ذائقے کی یہ محرومی کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ یہ نسلوں کی محرومی ہے۔ان کو محروم رکھنے کے اسباب بھی اس دھرتی میں بہت گہرے ہیں ان کا آغاز اُس دور سے ہوتا ہے۔جب انسان میں ملکیت کی حس نے جنم لیا حالات اب بھی جوں کے توں ہیں۔موجودہ معاشی نظام اور معاشرتی مسلمات کے درمیان ایک بے وسیلہ شخص جو عزت کی پونجی ہمراہ رکھتا ہے کے لئے معاشرے میں جینے کے راستے محدود ہو جاتے ہیں۔

بانجھ ہوا میں سانس" ایسا افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے معاشی ناانصافی کی تمام تر گھٹن اور ظلم کو بیان

کر دیا ہے اُنہوں نے ہوا سے تمام آکسیجن نکالنے اور اسکی راشننگ کی علامت کے ذریعے طبقاتی تقسیم پرمبنی موجودہ حریص اور بےحس ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ قدرتی وسائل جو انسان کو بلاتفریق زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں جب کسی انسان کے اختیار میں آ جائیں تو صورتحال بدل جاتی ہے اور ایک کمرے کے ایک دروازے والے مکان میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ زندگی گزارنے والا "فتیا" چھوٹے ملک کے سامنے گھٹنے ٹیک کر زندگی کی چند سانسیں خرید لیتا ہے منشایاد کا افسانہ "دنیا کا آخری بھوکا آدمی" طبقاتی تفریق کے حوالے سے ایک منفرد افسانہ ہے۔ شہروں میں بالائی طبقے کی عیاشیاں، سرمایہ داروں کے مظالم، مزدوروں اور محروموں کے دکھ تو منشایاد دیکھتے ہی ہیں مگر اس قصے کو نیا رخ بھی عطا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہیں شاید اُمید کی کرن کہیں دکھائی دیتی ہے مگر اس روشنی کا سفر مختصر بھی ہے۔ اسی لئے اس افسانہ میں وہ ٹوکریاں بیچنے والے بوڑھے کو پیسے نہ دے کر رات بھر اُلجھن کا شکار رہتا ہے مگر جب دوسرے روز اخبار میں گاڑی کے نیچے آ کر کسی بوڑھے کے مرنے کی خبر چھپتی ہے تو وہ اس کو وہی بوڑھا سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ سمجھ کر کہ مرنے والا وہی بوڑھا ہے گویا اس نے اپنی ذمہ داری موت کے سپرد کر دی۔

محسوس یوں ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے زندگی کو پریم چند کے کفن میں ایک لاش پر ناچتے اور بیدی کے شہروں میں کوڑے دانوں سے سانسیں چنتے دیکھا تو بھوک کا بوجھ ڈھوتے انسان اسے گلیوں میں آوارہ پھرتی روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے لمبی مسافتیں طے کرتی مخلوق سے مشابہ نظر آیا۔ منشایاد کا افسانہ "خواہش کا اندھا کنواں" اس حوالے سے مصنف کی حساسیت کی شدت کو اُجاگر کرتا ہے۔ بڑے بڑے بنگلے، کشادہ سڑکیں، پرانے محلے پُر رونق بازار رات گئے تک گاہکوں کا پیٹ بھرتے ڈھابے، حتیٰ کہ کوڑے کے ڈھیر بھی ایک نفس کے پیٹ میں دہکتی بھوک کی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

> "وہ جب سے پیدا ہوا تھا اُس نے پیٹ بھر کر کبھی نہ کھایا تھا اتنی بہت ساری روٹیاں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کر کھانے کی تمنا آج پوری ہو رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی روٹیاں نگلنے لگا۔ کاش اس کے کئی مُنہ ہوتے۔ روٹیاں چباتے ہوئے اس نے بہت سے آدمیوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا ان کے ساتھ روٹیوں والا بوڑھا بھی تھا۔ خطرے کی بو سونگھ کر وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اتنی ساری روٹیاں۔۔۔۔۔ زندگی کی سب سے بڑی تمنا کو ادھورا چھوڑ کر جانے کا جی نہ چاہا وہ مُنہ دوسری طرف کر کے بڑے اطمینان سے روٹیاں چباتا رہا جب وہ آخری روٹی چبا رہا تھا تو قریب ہی کہیں دھما کہ ہوا اسے لگا جیسے اسکے پیٹ سے روٹیاں پانی بن کر بہنے لگی ہوں"۔9

کچھ پرند پکھیرو، کتے، بلیاں ہمیشہ سے انسانی بستیوں میں بسیرا کرتے آئے ہیں اور یہیں پر بچے کھچے ٹکڑے گوشت اُتری ہڈیاں کھا کر سیر ہوتے رہے۔ اگلے وقتوں کی حسین روایت میں پرندوں کے لئے گھر کے صحن یا چھت پر دانے پانی کا انتظام ہوتا۔ شام ڈھلے تو دن کی باسی روٹی بھی کسی ذی روح کے کام آ جاتی۔ مگر یہ اس معاشی

نظام کا شاخسانہ ہے کہ افراط وتفریط کے درمیان خلیج روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے پاٹنا ناممکن ہو رہا ہے۔ افسانہ "خواہش کا اندھا کنواں" اسی خلیج میں اُگتی بھوک کا نوحہ ہے۔

"اس کا خیال یہ بھی تھا کہ وہ گزشتہ رات کے انتباہ کے بعد اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے سہمے ہوئے بیٹھے رہیں گے اور اس وقت تک اُنہیں کوئی آہٹ نہیں چونکا سکے گی۔ جب تک اُنہیں انصاف اور نیکی کا یقین نہ دلایا جائے۔ مگر جب مشینوں، فورمینوں اور ٹائم کیپروں نے حاضریوں کے رجسٹر کھولے اور ان کے نام پکارے تو ہر طرف سے لبیک سر اور حاضر جناب کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور اسے محسوس ہوا کہ وہ بستی میں اکیلا رہ گیا ہے"۔[۱۱]

منشا یاد کا افسانہ "دھوپ، دھوپ، دھوپ" بھی ارزل اور حقیر نسلوں کی بے فائدہ جدوجہد کی کہانی ہے جہاں سخت مشقت بھی حقائق کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ کہانی میں ایک ہی واقعے کا انطباق معاشی ظلم کا شکار پورے طبقے سے کیا گیا ہے۔ منشا یاد نے معاشی پسماندگی کا شکار طبقے کو خود اپنی حالت کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ایسے معاشرے میں جب کبھی کوئی آواز ظلم کے خلاف بلند ہوتی ہے تو اس آواز کا منبع ہی کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس پر طُرہ یہ کہ وہ آواز تنہا ہی خلاء میں بھٹکتی رہتی ہے۔ باقی آوازیں انجام سے خوفزدہ اپنی زندگیوں کو بچانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ افسانہ "دھوپ، دھوپ، دھوپ" میں یہی المیہ بیان ہوا ہے ظلم کے خلاف اُبھرنے والی آواز۔

ظلم کو للکارنے والی یہ آواز موت کے گھاٹ اُتار دی جاتی ہے۔ اپنے طبقے کی شعوری سطح سے بلند ہونے کی سزا اُسے مل جاتی ہے۔ معاشرے کے مسلمات اور فرد کو تفویض کردہ کردار سے باہر نکلنے کی کسی بھی کاوش کا ردعمل یہی ہوا کرتا ہے۔ اب یہی ردعمل سوسائٹی کی تسلیم شدہ طبقاتی تقسیم کے بہاؤ کو رواں اور جاری رکھتا ہے۔ اسی لئے افسانہ نگار اس افسانے میں آگے چل کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اب یہ اکیلا رہ جانے والا وجود درحقیقت سوسائٹی کے مسلمات سے بغاوت کرنے والی آواز کی کمزور سی بازگشت ہے جو بعد میں منشی کے سامنے اپنے نقطہ نظر سے تائب ہو جاتی ہے۔ منشی اور مرکزی کردار کے مابین مکالمے کے ذریعے افسانہ نگار نے یہ منکشف کیا ہے کہ معاشی لحاظ سے طبقوں میں بٹے ہوئے معاشروں میں وقتاً فوقتاً ایسے ارتعاش نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ بنے بنائے نظام میں جن کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔

منشا یاد اپنے افسانوں میں جب بھی کسی معاشی پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ گہرائی میں اُتر کر معیشت سے جڑے ہوئے انسانی رویوں کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانے "اوور ٹائم" میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کی بدولت جنم لینے والے طبقات کو ایسے متوازی دھاروں کی صورت میں بہتے دکھایا ہے جو کسی بھی موڑ پر ایک دوسرے کی حدود میں قدم نہیں رکھتے۔ ایک طبقہ جبری طور پر اور دوسرا اختیاری حالت میں ایسا نہیں کرتا۔ "اوور ٹائم" کا مرکزی کردار لاکھ کوشش کے باوجود اپنے افسر اعلیٰ کے غم میں شریک نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اسکی ایسی

کسی بھی شرکت کو اعلیٰ طبقے میں گوارہ نہیں کیا جاتا۔مذکورہ افسانے میں منشایاد نے ملازمت پیشہ افراد کے درمیان جو طبقاتی تقسیم ہے اُسکو اجاگر کیا ہے۔یہاں زیادہ وسائل زیادہ سہولتیں، زیادہ آمدنی اور فیصلوں کا اختیار انسانوں کو اعلیٰ ادنی کے درجے تفویض کرتا ہے۔سوسائٹی کے مسلمات ایک ادنی ملازم کو ۲۱،۲۰،۱۹ گریڈ والے افسروں میں بالشت بھر کا کر دیتے ہیں۔اُسکی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہوتی ہے۔" تھری سیٹر صوفے میں اس سمیت چار آدمی بیٹھے تھے شاید اُسنے کچھ بھی جگہ نہ گھیر رکھی تھی"۔۱۲؎

محروم طبقے کی معاشرے میں موجودگی بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس کے بغیر برتری کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔بے روزگاری اور معاشی محرومی کی طرف منشایاد نے اپنے بیشتر افسانوں میں اشارہ کیا ہے۔درحقیقت وسائل اور اور مواقع کی غیر منصفانہ تقسیم ہی بے روزگاری جیسے مسئلے کو جنم دیتی ہے۔

افسانہ " کوئی ہے " میں مصنف نے اپنے منفرد اسلوب اور کارگر الفاظ کے ذریعے اس تمام ذہنی اور نفسیاتی بوجھ کو موثر انداز میں بیان کیا ہے جو بے روزگاری کے سبب نوجوانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا ہے۔مصنف نے معاشی نظام کی بے رحمی کو یوں ظاہر کیا ہے۔

" تمہارے پاس کوئی تعلیمی ڈگری ہے؟

جی سر ڈگری تو ہے لیکن وہ اچھی نہیں ہے۔

کیا مطلب، نمبر کم لئے تھے؟

نہیں سر نمبر تو بہت تھے پچھلی بارشوں میں ہمارے گھر پانی چڑھ آیا تھا ٹرنک میں رکھی ساری چیزیں خراب ہوگئی ہیں وہ بھی بھیگ کر۔

لیکن ہمیں زیادہ پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت نہیں ہے بہتر ملازمت ملنے پر تم چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ویسے بھی ہم تمہاری ڈگری کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتے"۔۱۳؎

منشایاد مارکسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی مانند بانگ دہل فن کو نظریے کی کھونٹی پر نہیں لٹکاتے نہ ہی حقیقت نگاری کے نام پر اپنی تحریر کو واقعات کے ابلاغ کا ذریعہ بناتے ہیں بلکہ وہ معاش کی چکی میں پستے ہوئے لوگوں کے رویوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔معاشی مسائل فرد کی زندگی کو کس طرح جہنم زار بناتے ہیں۔اس کا ادراک رکھتے ہیں اور اپنے افسانوں میں انہی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

منشایاد نے اپنے افسانوں میں معاشی مسائل کو اُجاگر کرتے ہوئے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو طبقاتی ظلم غربت اور محرومی کے خلاف مقدور بھر مزاحمت کی ہمت رکھتے ہیں اگر چہ یہ احتجاج بہت نچلی سطح تک محدود رہتا ہے۔مگر اس کا ارتعاش بالائی سطح پر محسوس کیا جاتا ہے۔" کچی پکی قبریں" کا" کوڈو فقیر" چوہدریوں کی قبروں کے دیئے اپنے ماں باپ کی قبروں پر منتقل کر کے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا انتظام کرتا ہے۔"ماس اور مٹی" کا" نا

تو سانسی "صدیوں سے مردار کھانے والے شیرو کے برعکس معاشرے سے اپنے حصے کا زندہ گوشت چھیننے کی جرات کرتا ہے وہ ایسے معاشرے کی تمام قدروں کو بیخ و بن سے اُکھاڑ ڈالنا چاہتا ہے جس نے نسلوں سے اُسے معاشی نا انصافی کی بھینٹ چڑھائے رکھا۔ایسی ہی جراءت رندانہ کا مظاہرہ "پولی تھین" کا "کالو" پولی تھین کے لفافے نگل کر کرتا ہے۔گویا وہ اپنا استحصال کرنے والوں سے انتقام لے رہا ہو۔پولی تھین علامت ہے۔صنعت اور صنعت کاروں کے سرمائے کی جب کہ کالو محرومی اور بھوک کا شکار طبقے کا نمائندہ ہے۔"راستے بند ہیں" کا مرکزی کردار اگرچہ مزاحمت کرتا ہے مگر اُس کی مزاحمت کا دائرہ مختلف ہے۔

جہاں ہمیں معاشی نا انصافی کیخلاف منشا یاد کے مزاحمتی کردار نظر آتے ہیں وہیں اس مزاحمت کی الگ جہت بھی اُبھرتی ہے۔یہ ایسی مزاحمت ہے جو معاشرے کو معاشی نظام پر مبنی کوئی تنظیمی ڈھانچہ فراہم نہیں کرتی۔یہاں معاشی نا انصافیوں میں تخفیف کا بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا ایسا ممکن بھی نہیں کیونکہ منشا یاد حقیقتوں کے عکاس ہیں۔وہ قاری کو کوئی خواب دکھا کر کسی اُمید کی افیون نہیں دینا چاہتے۔بلکہ تلخ حقائق کو اُجاگر کر کے ظلم کے خلاف ایک احساس ندامت ضرور اُبھارتے ہیں۔طبقاتی تقسیم اور غربت کے شکار افراد کے لئے ہمدردانہ احساس کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

معاشی نا انصافی جاری وساری ہونے اور اس کے سامنے محروم افراد کی بے بسی کی گواہی ہمیں منشا یاد کے افسانوں میں تین سطحوں پر ملتی ہے۔اول سطح جہاں "کوڈو فقیر" کھڑا ہے جو اپنی بے بسی کا اظہار کرنے کے لئے رات کے اندھیرے میں چوہدریوں کی قبروں کی ہڈیاں اپنے ماں باپ کی ہڈیوں سے بدل دیتا ہے تاکہ ہر جمعرات کو اُن کی قبروں پر فاتحہ درود ہو اور دیا جلتا رہے۔یہ معاشی ظلم کے خلاف احتجاج کا انتہائی کمزور درجہ ہے۔یہاں باآوازِ بلند کچھ کرنے کی ہمت کا فقدان نظر آتا ہے۔

دوسری سطح پر ایسے کردار ہیں جو بے بسی کی انتہا پر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔"راستے بند ہیں" "کوئی ہے" اور "خواہش کا اندھا کنواں" کے مرکزی کرداروں کی موت اس جانب اشارہ کرتی ہے۔یہ اس بات کا بھی اعلامیہ ہے۔کہ معاشرتی سطح پر معاشی نا انصافی کے مسلمات میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کا کوئی امکان نہیں ہے۔جہاں کہیں کوئی ایسا امکان اُبھرتا ہے اُسے فنا کی گود میں سُلا دیا جاتا ہے۔یوں منشا یاد کے افسانوں میں موت ظاہر کرتی ہے کہ اُنہیں صدیوں سے جاری اس معاشی استحصال میں کمی کی کوئی اُمید نہیں ہے۔مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ افسانہ نگار قنوطیت کا شکار ہے۔بلکہ وہ اُمید کا ایک ایسا روزن دیکھتے ہیں جو بند تو ہے مگر اُسکے کھلنے کی سبیل کی جاسکتی ہے۔اُنکے نزدیک حالات اُسوقت مختلف ہو سکتے ہیں جب پسماندگی کا شکار تمام افراد کی آوازیں یک جہت ہو جائیں۔افسانہ "دھوپ، دھوپ، دھوپ" میں اُنہوں نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

معاشی استحصال کا شکار افراد کی بے بسی کی تیسری سطح وہ ہے جہاں بے بسی، غم و غصہ کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔معاشرتی مسلمات سے بغاوت کی لہر اُٹھتی ہے۔جو دھرتی اُنہیں رزق نہ دے اُسکے ہر خوشۂ گندم کو جلا دینے کی

تحریک پیدا ہوتی ہے۔ جہاں اندر کا بھونچال بربادی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔اس سطح پر "ناتوسانسی" کھڑا ملتا ہے۔ جو معاشی ناانصافیوں کا انتقام ڈربوں سے مرغیاں، باڑوں سے بھیڑ بکریاں چرا کر کھڑی فصلوں کو اُجاڑ کر اور چوہدریوں کی زندہ گائے کی ران کا گوشت نکال کر لیتا ہے۔

الغرض منشایاد کے افسانوں کا مطالعہ اس عہد کے معاشی مسائل کا انکشاف کرتا ہے۔ وہ معاشی ناانصافیوں کا تعلق گزشتہ تہذیبوں میں بھی تلاش کرتے ہیں۔ یہاں وہ استحصال زدہ طبقے کے افراد کے رویوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہیں ان مسائل کے اسباب دریافت کرتے ہوئے خود ظلم سہنے والوں کو اسکا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ منشایاد، ماس اور مٹی ،فیصل آباد،مثال پبلیشرز، جون ۲۰۱۰ء،ص:۱۰۲

۲۔ منشایاد،میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا ،اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن ۲۰۱۱ء، ص:۴۳۱

۳۔ منشایاد،ماس اور مٹی ،فیصل آباد: مثال پبلیشرز، جون ۲۰۱۰ء،ص:۱۰۲

۴۔ ایضاً،ص:۱۰۷

۵۔ منشایاد،بند مٹھی میں جگنو ،لاہور: گورا پبلیشرز، ۱۹۹۵ء،ص:۴۷

۶۔ منشایاد،ماس اور مٹی ،فیصل آباد: مثال پبلیشرز، جون ۲۰۱۰ء،ص:۱۸

۷۔ ایضاً،ص:۱۶

۸۔ منشایاد،بند مٹھی میں جگنو ،لاہور: گورا پبلیشرز، ۱۹۹۵ء،ص:۳۰

۹۔ ایضاً،ص:۳۰-۳۱

۱۰۔ منشایاد،میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا ،اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء،ص:۲۰۸

۱۱۔ ایضاً،ص:۲۰۹

۱۲۔ ایضاً،ص:۱۳۶

۱۳۔ ایضاً،ص:۴۷

مآخذ:

۱۔ منشایاد، میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا،اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۱ء

۲۔ منشایاد، بند مٹھی میں جگنو ،لاہور: گورا پبلیشرز، ۱۹۹۵ء

۳۔ منشایاد، ماس اور مٹی ،فیصل آباد،مثال پبلیشرز، جون ۲۰۱۰ء

۴۔ منشایاد،میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا ،اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۱ء